حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا
دعوتی اُسلوب

تالیف

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: ایچ، ایم، حسین ٹرسٹ
H.M.Husain Trust
Email: hmhamuwash@yahoo.com
Cell: +91 7095168679

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول: ربیع اوّل ۱۴۳۹ھ مطابق ڈسمبر ۲۰۱۷ء گریگورین Gregorian

نام کتاب: ابراہیم علیہ السلام کا دعوتی اسلوب

مصنف: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تعدادِ اشاعت: 2000

صفحات: 24

قیمت: ہدیہ: ایچ، ایم، حسین ٹرسٹ

کمپیوٹر کتابت: مولانا سید عبدالحمید قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحمانیہ، حیدرآباد)
Cell: +91 9849022015

باہتمام: انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی

انتساب

خان صاحب اے۔ ایس۔ عبدالقادر اور زوجتین علیہ الرحمہ
(انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی کے تایا اور تائی)

ملنے کا پتہ: (۱) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ 0522-2741539

(۲) دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی، یوپی 09807240512

ناشر: ایچ، ایم، حسین ٹرسٹ
H.M.Husain Trust
Email: hmhamuwash@yahoo.com
Cell: +91 7095168679

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، امابعد!

قرآن مجید انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس پر عمل کرنے سے ہماری زندگیاں اس دنیا میں اور آخرت میں سلامتی وسکون کی ہوگی، یہ خالقِ کائنات کا وعدہ ہے۔

میرے حضرت! مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری زندگی اس کی تعلیم وتربیت میں صرف کی اور اس تعلیم وتربیت سے کئی زندگیاں اللہ پاک کی رضامندی میں گزریں؛ اسی کی ایک کڑی ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دعوتی اُسلوب'' پیشِ خدمت ہے۔

آقائے کائنات سے التجا ہے کہ ہم سب کو اس سے استفادہ کی ہدایت اور توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اس کتابچہ کے معاونین کے ہم شکر گزار ہیں اور پروردگارِ عالم سے دُعا گو ہیں کہ اس کتابچہ کو قبول فرما کر ہم سب سے راضی ہوجائے اور ہم سب کو اللہ رب العزت سے راضی کرائے، آمین۔

طالبِ دُعا
انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی
ناظم
ٹی، ایم، حسین ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

چودھویں صدی کا اختتامی سال دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے ایک نہایت مبارک سال ثابت ہوا کہ اس میں دارالعلوم میں ایک اہم کام کا آغاز کیا گیا، ایک مستقل تعلیمی ادارہ اس غرض سے قائم ہوا کہ اس میں طلبہ کو دعوت وتبلیغ کے اُصول بتائے جائیں اور اسلامی فکر کی تربیت دی جائے، اس معہد کا نام المعهد العالی للدعوة والفكر الإسلامی تجویز ہوا، اس کا پہلا تعلیمی سال بہت ہی کامیابی کے ساتھ مکمل ہوا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے قرآن کریم کے اُسلوب دعوت پر اور عالم اسلام کے مشہور فاضل ڈاکٹر یوسف القرضاوی مدظلہٗ نے فکر اسلامی کے موضوع پر محاضرات (لکچرز) دیئے۔

جہاں تک قرآن کے اُسلوب دعوت کا تعلق ہے وہ نہ صرف یہ کہ اس معہد کا اہم ترین موضوع تھا بلکہ خود دارالعلوم کے تربیتی تخیل کا آئینہ دار تھا، ندوہ کی تاسیس جن مقاصد کے لئے ہوئی تھی ان میں اہم ترین مقصد دعوت دین کے لئے ذہنی وعلمی تربیت دینا تھا؛ اگر آپ ندوہ کے نصاب پر ایک نظر ڈالیں تو صاف نظر آئے گا کہ پورا نصاب جس محور کے گرد گھومتا ہے وہ قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ ہے اور تبلیغ ودعوت کی رُوح اس پورے نصاب میں کارفرما ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی زبان کو ایک ایسی زندہ زبان کی طرح پڑھانے کا نظم کیا جو صرف کتابوں میں محدود نہیں ہے؛ بلکہ وہ تقریر وتحریر، علم وادب، تبلیغ ودعوت اور

سیاست وصحافت کی بھی زبان ہے، برصغیر کی درسگاہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ندوہ کو اس خصوصی توفیق سے نوازا جس کا محرک سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہے کہ عربی زبان دعوتِ دین کا اولین ذریعہ ہے، اس کے ذریعہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تہہ تک پہونچا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۝

(سورۃ ابراھیم)۔

''اور ہم نے جس پیغمبر کو بھیجا اس کی زبان وہی تھی جو اس کے بھائی بندوں کی زبان تھی تاکہ وہ واضح کرکے بتاسکے''۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے برصغیر کے مدارس میں پہلی مرتبہ قرآن کریم کا نص (متن) (سلف کی تفسیروں کی روشنی میں) نصاب میں داخل کیا، قرآن کریم اور ادب عربی یہی دو بنیادی عناصر ہیں جن سے دعوت وتبلیغ کا ذہن تیار ہوسکتا ہے اور اس کی صلاحیت وقدرت پیدا ہوسکتی ہے اور جب تک کہ قرآن کریم سے شغف نہ ہو اور وہ ایک زندہ کتاب کی طرح نہ پڑھا جائے اور عربی زبان کا صحیح مذاق حاصل نہ ہو اس وقت تک دین کی صحیح فکر اس کے اولین مآخذ سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

ایک داعی اور مبلغ میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں، اس کو کس طرح کا اندازِ گفتگو اختیار کرنا چاہیے، وہ ''حکمت'' کیا ہے جو تبلیغ دین کے لئے ضروری ہے اور جس کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایت ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۝

(سورۃ النحل)

''اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ''۔

ان سوالات کے تمام جوابات خود قرآن کریم میں موجود ہیں اور وہ اتنے اچھوتے

اور نرالے انداز میں ہیں کہ اس سے زیادہ دلنشیں انداز کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے، قرآن کریم نے قصص کے ضمن میں انبیاء کرام کے مکالمات نقل کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان سے اگر کسی نے کج بحثی (مجادلہ) کی تو انھوں نے کس انداز سے اس کا منہ بند کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کس لہجے میں سنائی؟ نافرمانوں کو وعید کس اسلوب میں دی گئی؟ دعوت کن الفاظ میں کس طریقہ سے اور کس اُسلوب سے دی؟ یہ بنیادی اُصول ہیں، جن سے کوئی مبلغ دین بے نیاز نہیں ہوسکتا اور کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں بھی انبیائے کرام کے طریقۂ کار کو نظر انداز کرکے دین کی دعوت نہیں دی جاسکتی۔

اس معہد کی خوش نصیبی ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر محاضرات کا سلسلہ شروع فرمایا اور یہ معہد ان ہی کی توجہات کا ثمرہ اور ان آرزوؤں کا حاصل ہے جو بانیانِ ندوۃ العلماء کے دل و دماغ میں پرورش پاتی رہی تھیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہتر اس موضوع کا حق شاید ہی کوئی ادا کرسکتا اس لئے کہ اولاً آپ کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کا وہ ذوق دیا ہے جو اہلِ زبان کو عطا ہوتا ہے اور اہلِ زبان میں بھی ان کو ملتا ہے جن کے اندر فطری و وجدانی ذوق ہوتا ہے اور جس کو وہ اپنے علم و مطالعہ سے جلا دیتے ہیں، دوسرے اس لئے کہ قرآن کریم آپ کا خاص موضوع ہے، اسی کے طالب علم رہے ہیں اور سالہا سال اس کی تعلیم دی ہے اس کا ذوق ان کے ریشہ ریشہ میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے ؎

شاخ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

مولانا نے تبلیغ و دعوت کا کام عمومی درس قرآن سے شروع کیا تھا جس کا سلسلہ ''ادارۂ تعلیمات اسلام'' اور لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں سالہا سال جاری رہا اور جس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات، اہل علم اور عامۃ المسلمین بڑی تعداد میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی تقریباً دس سال تک آپ نے مختلف درجات میں قرآن مجید کا درس دیا، ان کی تصنیفات اور تحریروں میں قرآن مجید کے مطالعہ

وتدبّر اور ذوق وشغف کا فیض صاف نظر آتا ہے اور وہ ان کی تقریر وتحریر کی تاثیر کا راز ہے، یہ مصرعہ ان کے حسبِ حال ہے ؎

اُنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم

مزید برآں آپ کے متعدد مقالات اور مستقل کتابیں موجود ہیں، جو قرآن کریم کے بعض اہم مسائل ومباحث کی فکر انگیز تفسیر تسلیم کی گئی ہیں، اُردو میں ''مطالعہ قرآن کے اُصول ومبادی'' اس کا ایک نمونہ ہے (جو آپ کے ان افادات ومضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۰-۴۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں اثنائے درس میں مرتب وقلمبند ہوئے تھے) سورۂ کہف کی تفسیر میں آپ کی مستقل کتاب جو اصلاً عربی میں الصراع بین الایمان والمادیة اوتأملات فی سورة الکهف کے عنوان سے شائع ہوئی پھر اس کا ترجمہ اُردو اور انگریزی میں شائع ہوا، ماثورہ دعاؤں کی ادبی بلاغت کو ایک مقالہ میں قلمبند فرما چکے ہیں، جس میں دکھایا ہے کہ جامعیت اور انسانی ضروریات کا اس درجہ ادراک اور باریک بینی کے ساتھ ہر ہر حاجات کو سامنے لاکر اس کے لئے مناسب ترین الفاظ میں دُعا کرنا بلاغت نبوی کا معجزانہ اُسلوب ہے۔

پیش نظر خطبات دراصل وہ لکچرز ہیں جو آپ نے عربی میں معہد عالی کے طلبہ کے سامنے دیئے تھے، ان کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ یکجا کیا گیا مولانا کی نظر ثانی کے بعد روائع من ادب الدعوة فی القرآن والسیرة کے نام سے یہ کتاب مطبع ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی۔

میں اپنے عزیز طلبہ مولوی ظریف احمد اور مولوی محمد صدر الحسن کا شکر گزار ہوں کہ ان عربی محاضرات کے جمع کرنے اور ان کو مرتب کر کے نقل کرنے میں انھوں نے گراں قدر مدد کی۔

مقام مسرت ہے کہ اس کتاب کے عربی سے اُردو میں منتقل کرنے کا نازک اور مشکل کام اسی درسگاہ کے ایک لائق ونامور فاضل اور دونوں زبانوں کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے اور صاحبِ قلم ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی استاذ جامعۃ اُم القری مکہ معظّمہ کے

ہاتھوں انجام پایا، جو اس خدمت کے لئے ہر طرح موزوں تھے اور جو اس کی بہتر سے بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ان خطبات سے علماء و مبلغین اور عام مسلمانوں کو مستفید فرمائے اور اس سلسلہ کو نافع بنائے اور مولانا مدظلہ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔

والله ولی التوفیق وبه الثقة

محمد رابع حسنی ندوی

(صدر معہد دعوت وفکر اسلامی)

دار العلوم ندوۃ العلماء

۱۶/۵/۱۴۰۱ھ

۲۳/۳/۱۹۸۱ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے

مناسب ہوگا کہ آج ہماری مجلس کا موضوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے ہمیں ملتے ہیں؛ اگر ہم ان دونوں نمونوں کو سامنے رکھیں اور ان کا باہمی موازنہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ''حکمت'' (جو دعوت کا اولین عنصر ہے) کس درجہ کمالِ حسن کے ساتھ ان کی دعوت میں جلوہ گر ہے اور پیغمبرانہ اندازِ تبلیغ کی مکمل نمائندگی ان کے طرزِ خطاب میں موجود ہے۔

ایک نمونہ تو وہ ہے جب کہ انہوں نے اپنے والد کو دینِ حق کی دعوت دی اور دوسرا نمونہ وہ ہے جس میں انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب فرمایا، ان دونوں دعوتوں کے اندازِ بیان میں حکیمانہ تنوع پایا جاتا ہے، صرف اندازِ گفتگو اور پیرایۂ بیان ہی میں فرق نہیں ہے؛ بلکہ موقع کا لحاظ اور مخاطب کی نفسیات کا گہرا علم بھی جھلکتا ہے اور یہ کہ کس طرح دل کی پہنائیوں میں بات اُتار دی جائے، آپ اگر ان آیات کو پڑھیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس گفتگو کو نقل فرمایا گیا ہے جو انہوں نے اپنے والد کو دین کی طرف بلانے کے سلسلے میں کی؛ پھر اس خطاب کو ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے اپنی قوم سے کیا تو آپ کو دونوں میں واضح فرق نظر آئے گا۔

ایک فرزند اپنے باپ کو دین کی دعوت دیتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾ (سورۃ مریم)

''اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو، بیشک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں، ابا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جایئے میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا، ابا شیطان کی پرستش نہ کیجئے، بیشک شیطان خدا کا نافرمان ہے، ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں''۔

ان آیات میں حسب ذیل اُمور واضح طور پر نظر آئیں گے:

(۱) پدرانہ شفقت کے جذبہ کو اُبھارا گیا ہے: یٰٓاَبَتِ کے طرزِ خطاب پر غور کیجئے، میرے باپ (یا میرے ابا جان، میرے بابا، جس طرح بھی آپ ترجمہ کریں) اس اندازِ خطاب میں بیٹے کی سعادت مندی، محبت اور فروتنی پوری طرح نمایاں ہے، اس اندازِ خطاب کے لطف کو سمجھنا ذوقِ سلیم پر موقوف ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان سے آشنا کیا ہے اور وہ اس کے لہجے کی روح کو سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ ایسی آیت پڑھتے تھے جن میں عذابِ الٰہی کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی آواز میں لرزش آجاتی تھی اور چہرہ ڈر سے سرخ ہو جاتا تھا اور جب ان آیات کو پڑھتے جن میں اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت کا ذکر ہے تو ان کا دل پسیجتا اور آواز میں محبت کا سوز اور نرمی

نمایاں ہوتی، جب ایک فرزند اپنے باپ کو میرے بابا یا میرے ابا جان کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ اس کے جذبۂ شفقت پدری کو بیدار کرتا ہے؛ اگر داعیانہ تکبر کے ساتھ وہ کہتا: جناب والا! سنئے، یا اے کاہن بزرگ! غور کیجئے!! آذر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کاہن (معبد کے پروہت بھی تھے) تو اور ہی بات ہوتی، مگر وہ فرماتے ہیں، میرے ابا جان! (یٰٓاَبَتِ) اور سمجھ بوجھ کر قصداً انھوں نے یہ اندازِ مخاطبت اختیار فرمایا تھا کہ ان کی بات دل کی گہرائیوں تک پہونچ جائے اور پدرانہ محبت دل کی دروازے کھول دے، ایک باپ خواہ وہ جتنا بھی اپنے فرزند سے خفا ہو لیکن جب وہ اس کو ''میرے ابا جان'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے اور اس کی بات سننے کی طرف وہ مائل ہو جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت میں جذبۂ ایمانی سے پہلے شفقت پدری کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑا اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات محبت ایمان سے پہلے دل میں گھر کرتی ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شفیق باپ تو ہو مگر مؤمن نہ ہو، اس کی شفقت کا سوتا جاری ہے اور ایمان کا سوتا خشک ہے؛ لہٰذا اگر اس کو دعوت دینا ہے تو اس دروازے سے داخل ہونا ہوگا جو کھلا ہوا ہے، ایک داعی و مبلغ جسے ''حکمت'' کی نعمت ملی ہے، کبھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا؛ اگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کرے گا تو خود اپنی ذات کو بھی نقصان پہونچائے گا اور دعوت کو بھی، داعی و مبلغ اگر درشت مزاج ہو تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴿١٥٩﴾ (سورۃ آل عمران)

''اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا ابو طالب کو مخاطب فرمایا اور ایک انتہائی نازک صورتِ حال کے موقع پر تو خطاب اس طرح فرمایا يَاعَمِّ (چچا جان!) یہ وہ موقع ہے جب اسلام کے بارے میں ابو طالب گومگو کے عالم میں تھے اور قریش کے مقاطعہ کا خوف ان پر طاری تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَا عَمُّ! وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِي، وَالْقَمَرَ فِيْ

يَسَارِيْ عَلَى أَنْ أَتْرُكَ هَذَا الْأَمْرَ حَتَّى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيهِ مَا تَرَكْتُهُ (سیرۃ ابن ہشام، ق:۱/ ۲۶۵، ۲۶۶)۔

''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب بھی رکھ دیں اور کہیں کہ اس مہم سے باز آجاؤ تو بھی میں اس کو نہیں چھوڑوں گا اور اس وقت تک اس میں لگا رہوں گا تا آنکہ اللہ اس دین کو غالب کردے یا میں اس کے پیچھے اپنی جان قربان کردوں''۔

اس نرم گفتاری (جو اپنے مسلک پر پختگی کے ساتھ تھی) کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوطالب کا انسانی جذبۂ ہمدردی اور شفقت اُبھر آیا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آبائی دین پر قائم رہے مگر انھوں نے کہا: يَاابن أخي! ''اے میرے بھائی کے بیٹے'' (لفظی ترجمہ تو یہی ہوا مگر اس لہجہ میں شفقت کا اثر ہے جیسے کوئی کہے میرے بیٹے! میرے بچے!) جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا تھا، چچا جان! کہہ کر اسی طرح جواب بھی میرے عزیز! یا میرے بیٹے کہہ کر ابوطالب نے دیا اور فرمایا:

اِذْهَبْ يَابْنَ أَخِي، فَقُلْ مَا أَحْبَبْتَ، فَوَاللّٰهِ لَاأُسْلِمُكَ لِشَيْءٍ أَبَدًا (سیرۃ ابن ہشام، ق:۱/ ۲۶۵، ۲۶۶)۔

''میرے بیٹے! تم اپنا کام کرتے رہو اور جو جی چاہے کہو میں اللہ کی قسم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کروں گا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دلائل کا حسن انتخاب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے گفتگو کے وقت منطقی گرفت سے کام نہیں لیا اور نہ ایسی باتیں کہیں جن کو صرف بڑے ذہین قسم کے لوگ (Intelligencia) ہی سمجھ سکیں؛ بلکہ روزمرہ کی، آئے دن کی اور جانی بوجھی باتوں سے ابتداء کی، ایسی بات کی جو ایک بچے کی بھی سمجھ میں آسکے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ ان کے والد اگرچہ عمر رسیدہ تھے مگر ''عقل کا بچپن'' ختم نہیں ہوا تھا؛ لہٰذا ان سے کہا: ابا جان! آپ کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں

جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ کسی کام آسکے، پھر فرمایا کہ مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے جس کی آپ کو خبر نہیں ہے، یہ بات بھی بجائے خود ایک باپ کو خوش کرنے والی ہے کہ اس کا بیٹا علم وفہم میں، سمجھ بوجھ میں اس سے بڑھ جائے اور یہ کوئی اچنبھے کی، یا خرقِ عادت قسم کی بات نہیں تھی، بہت دیکھا گیا ہے کہ باپ ناخواندہ ہے اور بیٹا پڑھ لکھ کر عالم فاضل ہوگیا ہے، یا باپ نے کم پڑھا ہے، بیٹا باپ سے بڑھ گیا ہے؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ابا جان! مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے جس کی آپ کو خبر نہیں ہے؛ لہٰذا میری پیروی کیجئے، میں آپ کو صحیح راستہ بتاؤں گا، ابا جان! شیطان کی پرستش نہ کیجئے، شیطان، رحمان کا نافرمان ہے، ان آیات میں سے ہر آیت اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتی ہے، معانی وحکمت کے خزانے ان کے اندر بند ہیں، شیطان کا نام تو لیا مگر اس کی ماہیت اور کوئی علمی باتیں نہیں کیں؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے والد جب اس درجہ سادہ لوحی کا کام کرسکتے ہیں کہ بت تراشی کو اپنا پیشہ بنالیں تو ان سے یہ توقع بیکار تھی کہ وہ گہری اور نازک قسم کی بات سمجھ سکیں گے؛ لہٰذا ان کو صرف اسقدر بتانے پر اکتفا کیا کہ ابلیس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ خدائے رحمان ورحیم کا نافرمان ہے، آخر میں کہا: ابا جان! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں (رحمان) سب سے بڑا رحم فرمانے والے کا عذاب نہ آپ پر آجائے جس کے نتیجہ میں آپ شیطان کے گروہ کا ایک فرد بن جائیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم کو دعوت، فطرت انسانی اور حقائق کی بنیاد پر گفتگو:

ایک انداز بیان یا دعوت کا اُسلوب وہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا تھا جو ابھی آپ نے سنا، اب دوسرا اندازِ بیان یا اُسلوب دیکھئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا، دونوں کا فرق خود ظاہر ہوجائے گا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾
قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ

تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کا حال پڑھ کر سنادو، جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی پوجا پر قائم ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدے دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں''۔

ان آیاتِ کریمہ پر غور کیجئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ فراست اور حکیمانہ بالغ نظری کا اندازہ کیجئے، انھوں نے اپنی قوم کے معبودان باطل کی کوئی ہجو نہیں کی اور نہ ان کو برے نام سے یاد کیا؛ اگر ایسا کرتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے مخاطب بپھر جاتے اور سرے سے بات سننے ہی کے لئے تیار نہ ہوتے؛ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بجائے خود کچھ کہنے کے انہی کو مجبور کیا کہ وہ بولیں، فرمایا: مَا تَعْبُدُوْنَ؟ کس چیز کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟:

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی پوجا پر قائم ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدے دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں منطقی دلائل سے کام نہیں لیا اور نہ فلسفیانہ موشگافی کی، صرف یہ سوال کیا کہ آیا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری پکار سنتے ہیں؟ نفع یا نقصان پہونچاتے ہیں؟ کیونکہ انسانی زندگی انہی دو بنیادوں پر قائم ہے، انسان کو جب پکارا جائے تو سنے، پھر نفع کی اس سے امید ہو یا نقصان کا خوف ہو یہی وہ دو سرے ہیں جن سے انسانی زندگی بندھی ہوئی ہے، ایک انسان کا دوسرے انسان سے، ایک سوسائٹی کا دوسری سوسائٹی سے تعلق انہیں بنیادوں پر قائم ہے، نفع کی امید اور نقصان کا خوف، سچ یہ ہے کہ زندگی کی پوری گردش اس بنیادی نقطہ سے مربوط ہے۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''کہنے لگے (یہ بات نہیں کہ وہ ہمیں فائدہ یا نقصان پہونچاتے ہیں) بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے''۔

یہی وہ بات تھی، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے منھ سے کہلانا چاہتے تھے؛ کیونکہ یہ جواب دراصل جہل وعاجزی کا اعتراف ہے، وہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے تھے، یعنی یہ جو نام وہمی معبودوں کے رکھے ہیں، ان کا کہیں وجود بھی ہے؟ یہ ہاتھوں سے تراشے ہوئے اور پتھروں کے سہارے کھڑے کئے ہوئے بت، یہ وہمی اور افسانوی معبود جن کا کہیں وجود نہیں، ان کا زندگی سے کیا رشتہ ہے اور انسانوں کے لئے کیا کر سکتے ہیں کس درجہ کا مداوا بن سکتے ہیں؟ کس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں، کوئی علمی توجیہ کوئی حقیقت اور علم پر مبنی بنیاد بھی ان کی ہے؟۔

ذہانت، قوت گفتار اور مخاطب کی مدافعانہ صلاحیت سے فائدہ اٹھانا:

ان آیاتِ کریمہ کو بار بار پڑھیے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں ایک جہانِ معانی آباد ہے، ایک معنی سے دوسرے معنی روشن ہوں گے، ایک بات سے دوسری کارآمد بات نکلے گی اور ان دونوں انداز بیان (والد کو دعوت دینے اور قوم کو مخاطب کرنے) کا فرق واضح ہوگا اور یہ اندازا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر برحق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس درجہ انسانی نفسیات پر عبور عطا فرمایا تھا اور ذہن وقلب کے باریک سے باریک سوتوں کو جگانے اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مہارت انہیں حاصل تھی، اپنے مخاطبین سے کس طرح انھوں نے وہ سب کچھ اُگلوالیا جو ان کے دل ودماغ میں محفوظ تھا، ان کی ذہانتیں، قوتِ گفتار، مدافعانہ صلاحیتیں سب ظاہر ہوگئیں اور آخر میں ان کے ترکش کا آخری تیر بھی نکلوالیا:

بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے پایا ہے''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جواب کہلا کر گویا اُن سب کی جھولی خالی کروالی، اب وہ

دیوالیہ ہو چکے تھے، ان کے پاس کچھ کہنے کو رہ نہیں گیا۔

اب اس کے بعد اپنی دعوت شروع کی، اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید سے اُن کو آشنا کرنا شروع کیا، فرمایا:

أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّىٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٧٧﴾ ٱلَّذِى خَلَقَنِى فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَٱلَّذِى هُوَ يُطْعِمُنِى وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَٱلَّذِى يُمِيتُنِى ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿٨١﴾ وَٱلَّذِىٓ أَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لِى خَطِيٓـَٔتِى يَوْمَ ٱلدِّينِ ﴿٨٢﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی، وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا''۔

قرآن کریم کا طرزِ اثبات مفصل اور نفی مجمل:

یہاں قرآن کریم کا ایک عجیب دل آویز نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جملہ سے توجہ ہوئی، وہ فرماتے ہیں: فلاسفۂ یونان جب اللہ جل شانہ کی صفات کا ذکر کرتے (جس کو وہ اپنی فلسفیانہ زبان میں ''واجب الوجود، یا ''مبدأ فیاض'' سے یاد کیا کرتے تھے) تو وہ ان صفات کی زیادہ تفصیل اور گہرائی میں جاتے تھے، جو ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے مناسب نہیں ہیں، یعنی سلبی صفتیں (وہ ایسا نہیں ہے اور اس بات سے مبرا ہے) اور جب اثباتی صفات کا ذکر ہوتا (اللہ ایسا ہے اور اس کی یہ صفت ہے) تو اس میں اجمال سے کام لیتے، اس طرح فلسفہ میں سلبیات کا بیان مفصل ہے اور ایجابیات کا ذکر اجمالاً ملتا ہے، برخلاف قرآن کریم کے اس میں ایجابیات کی تفصیل ہے اور

سلبیات کا اختصار ہے، دوسرے آسمانی مذاہب اور انبیاء کرام کی تعلیمات میں یہی مشترک وصف ملے گا کہ اثبات مفصل اور نفی مجمل ہے (کتاب النبوات، از شیخ الاسلام ابن تیمیہ، الفاظ مؤلف کے ہیں)

اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثباتی بیان قرآن کریم کی ان آیات میں پڑھئے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ۚ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾

(سورۃ الحشر)۔

''وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ چھپی اور کھلی ہر بات کو جاننے والا ہے، وہی ہے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے، وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) سالم، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی والا، خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے، وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد واختراع کرنے والا، صورتیں بنانے والا اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے''۔

اور سلبی صفت کا ذکر پڑھئے:

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱۱﴾ (الشوری)۔

''اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے''۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا کہ سلبی صفات خواہ سیکڑوں کی تعداد میں ہوں، ان کا وہ اثر نہیں پڑ سکتا جو ایک اثباتی بیان کا ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل سچی بات کہی ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہماری یہ زندگی اور گزری ہوئی نسلوں کی زندگیاں گواہ ہیں کہ انسانی زندگی اثبات پر قائم ہے نہ کہ نفی پر، نفی کی نسبت انسانی زندگی اور تمدن میں بہت معمولی ہے۔

دِلی جوش اور اُمنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جواب کو سن کر کہ ''ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور انہی پر جمے بیٹھے رہتے ہیں'' فرمایا کہ کیا تمہاری وہ سنتے ہیں، جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا تم کو فائدہ پہونچاتے ہیں یا ضرر پہونچاتے ہیں؟ اس ارشاد میں ''نفی مجمل'' ہے اور جب اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہوا اور دعوت کی بات آئی تو اس میں وسعت بیانی اور فراخ دامانی سے کام لیا اور اثبات مفصل کا رنگ آ گیا اور فرمایا:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾ (سورۃ الشعراء).

''وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفاء بخشتا ہے اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا''۔

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات کا ذکر ہے (تخلیق، ہدایت، رزق، شفا اور موت وحیات پر قدرت) جب کہ بتوں کے سلسلہ میں جو سوال کیا اس میں صرف دو باتیں دریافت کی تھیں، کیا وہ دُعا سنتے ہیں؟ اور کیا وہ نفع وضرر پر قدرت رکھتے ہیں؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا نام آیا اور اس کا ذکر شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی رُوح جھوم اُٹھی ہو اور وجد سا آ گیا ہو، جوش اور اُمنگ کے ساتھ بیان کرنے لگے، فطری بات

ہے کہ انسان جب کسی شی میں لذت محسوس کرتا ہے تو اگر وہ کھانے کی ہوتی ہے تو دیر تک منہ میں رکھتا ہے، کام ودہن کو زیادہ سے زیادہ مزہ لینے کا موقع دیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی تلخ شی ہوئی اور اس کا استعمال ضروری ہوا تو جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک ہی گھونٹ یا ایک ہی نوالہ میں اس کو حلق سے اُتار لیتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر چھیڑا تو جذبات میں جوش اور ایمان میں حرکت آ گئی اور فرمایا: ''یہ میرے لئے باعث ضرر ہیں، مگر ہاں رب العالمین! جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے اور جو کہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا اور جس سے مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے روز میری غلط کاریوں کو معاف کر دے گا''۔

دل کی آواز موقع ومناسبت کی جستجو نہیں کرتی:

اتنا کہنے کے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی، جیسے ہی اللہ کا نام زبان پر آیا دل اُمنڈ آیا، موقع ومناسبت سے بے نیاز ہو کر دل کی آواز دُعا بن کر نکلنے لگی:

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''اے پروردگار مجھے علم ودانش عطا فرما اور نیکوکاروں میں شامل کر اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک کر اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں میں کر''۔

اتنا عرض کرنے کے بعد باپ کی یاد آ گئی؛ کیونکہ وہ بت پرستوں کے قائد اور مندر کے بڑے پجاری اور مشہور کاہن تھے اور فرمایا:

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ (سورۃ الشعراء)۔

''اور جس دن لوگ اٹھا کھڑے کئے جائیں گے، مجھے رُسوا نہ کیجیو جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل

لیکر آیا (وہ بچ جائے گا)"۔

ان آیتوں کے بعد یہ بھی پڑھئے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۲۲﴾ (سورۃ النحل)۔

بے شک ابراہیم علیہ السلام (لوگوں کے) امام (اور) خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے"۔

تمت بالخیر

کون سا در ہے نہ جس در سے کوئی خالی پھرا

محترمہ خیر النساء بہتر صاحبہ

کون سی سرکار ہے جس کا ہے سب کو آسرا　　کون سا دربار ہے جس میں ہے ہر کوئی کھڑا
کون سا وہ شاہ ہے جس کا ہے ہر کوئی گدا　　کون سا در ہے نہ جس در سے کوئی خالی پھرا

آج اسی سرکار سے میں بھی تو پا کر شاد ہوں
آج اسی دربار سے میں بھی تو خوش ہو کر پھروں

یاالٰہی واسطہ آدم صفی اللہ کا　　یا الٰہی واسطہ موسیٰ کلیم اللہ کا
یا الٰہی واسطہ تیرے خلیل اللہ کا　　یا الٰہی واسطہ احمدؐ حبیب اللہ کا

اب تو تو دے ایسی خوشی جس میں نہ ہو کچھ رنج و غم
جو رہے باقی جہاں میں اور کبھی ہووے نہ کم

کیا دعا میری تجھے آتی نہیں یا رب پسند　　کیوں نہ اس دربار سے پا کر ہوئی میں بہرہ مند
کیا سبب ہے جو ہوا ہے بابِ رحمت مجھ پہ بند　　کس لئے ناراض ہے کیونکر ہوئی میں دردمند

اب تو خوش ہو جا الٰہی مصطفےٰ کے واسطے
بابِ رحمت کھول دے خیر النساء کے واسطے

حضرت یوسفؑ کو جس دم چاہ میں دہشت ہوئی اور نکلنے کی نہ واں سے جب کوئی صورت ہوئی
پھر جو تنہائی سے انکو اس گھڑی وحشت ہوئی باب رحمت سے ترے حاصل انھیں فرحت ہوئی
بھیج کر جبریلؑ کو تو نے تسلی دی انھیں
بعد اسی تکلیف کے پھر سلطنت بخشی انھیں

ہم گہنگاروں پہ بھی تیرا بڑا احسان ہے نام تیرا یا الٰہی قادر ذی شان ہے
تیرا ہی انعام سب پر ہر گھڑی ہر آن ہے تو جو چاہے دے ترے نزدیک سب آسان ہے
گو میں اس قابل نہیں ہوں ہے مگر سب کو ملا
بیکسوں کا ہے تو ہی فریاد رس رب العلا

ہو گئے ایوب صابر جب بلا میں مبتلا رہ گیا رہ گیا ان کو نہ کچھ بھی زندگی کا آسرا
پھر پکارا جب انھوں نے تجھ کو اے رب العلا تو نے اپنی خاص رحمت سے انھیں چنگا کیا
ویسی ہی کر عافیت اب تو مریضوں کو عطا
یا الٰہی سن لے مجھ ناچیز کی اب یہ دعا

مر دہیں جتنے جہاں میں سب رہیں زندہ ہمیش کوئی آفت، کوئی بیماری کبھی آئے نہ پیش
عیش میں سب کو بسر ہو دل کسی کا ہو نہ ریش صحت و روزی و عزت روز افزوں روز پیش
ساتھ ایماں کے خوشی سے میں بھی کر جاؤں سفر
اپنی قدرت سے مجھے بھی کر دے ایسا بہرہ ور

یا الٰہی اب جہاں میں مبتلائے غم نہ کر دل مرا پر غم نہ کر اور چشم میری نم نہ کر
فکر غم سے ہوں میں لاغر پشت میری خم نہ کر جو نگاہِ رحم ہے مجھ پر تری وہ کم نہ کر
دے رہائی قید غم سے اے خدا اب تو مجھے
بس بڑی امید سے میں نے پکارا ہے تجھے

پیٹ میں مچھلی کے یونس جس گھڑی نالاں ہوئے اور پریشانی میں پھنس کر بے سروساماں ہوئے
بارگہ میں جب تری وہ لطف کے خواہاں ہوئے تو نے کی ایسی مدد جس سے کہ وہ شاداں ہوئے

ایسے ہی اپنے کرم سے اے خدائے پاک ذات
مشکلیں آسان کر اور درد وغم سے دے نجات

آتش ابراہیم پر کی تو نے جیسے گلستاں ویسے ہی اب گلخن غم سے مجھے بھی دے اماں
گو ہوں میں اک بدترین وکمترین وکمتراں تیری رحمت تو وہی ہے کر مجھے بھی شادماں

مجھ پہ کر ایسا کرم جس سے کہ بدنامی نہ ہو
میرے کاموں میں مرے اللہ ناکامی نہ ہو

تیری رحمت پر نظر کر کے میں کرتی ہوں دعا چاہے بخشے اور جو چاہے کرے تو ہے خدا
مجھ کو تیری ذات پر لیکن بھروسا ہے بڑا اور تیرے فضل کا مجھ کو ہے ہر دم آسرا

گر کرے بہتر مجھے تو فضل ہے تیرا بڑا
کیا طلب تجھ سے کرے یہ منھ ہے کس قابل مرا